

بسم اللہ الرحمن الرحیم ط

اشارات

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلم قوم کو اپنے دین سے برگشتہ کرنے اور اس کی متابع ایمان کی قیمت گرانے میں حکمران قوم کی معاشی پالیسی اور سیاسی اداروں کی جارحانہ کارروائیوں کو بھی کافی دخل حاصل رہا ہے، لیکن اسے بحیثیت ایک ملت جو عظیم نقصان نظام تعلیم کی تبدیلی سے پہنچا ہے وہ سب سے زیادہ المناک اور افسوسناک ہے۔ اس سے اس قوم کے نوجوانوں کے فکر و نگاہ کے زاویے بدلے۔ سوچنے اور سمجھنے کے انداز میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ معیار خیر و شر میں ایک نیا پیمانہ اختیار ہونا ایمان انداز میں کی جگہ ریب و تشکک نے لے لی۔ جو خوب تھا وہی تبدیل ہو گیا اور ناخوب سرا سر خوب بن گیا۔

دنیا کا ہر نظام تعلیم کسی خاص کلچر یا تہذیب کو پروان چڑھانے کے لیے معرض وجود میں آتا ہے اس لیے ہر وقت قوم اپنے نظام تعلیم کو اس طریق سے مرتب کرتی ہے کہ اس سے اس کے نوجوانوں کی علمی و فکری ترقی ہو سکے اور جب بڑے ہو کر وہ جنگاہ حیات میں عملاً شریک ہوں تو اس بنیادی اور اساسی تخیل کی خدمت کریں جس پر ان کے قومی شخص کا دار و مدار ہے۔ اسی وجہ سے جب کسی قوم کا شیرازہ منتشر کرنا مقصود ہوتا ہے تو اس کے نظام تعلیم کو تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ اور یہ تبدیلی بالکل تھوڑے عرصے میں پوری کی پوری قوم کو ہاتھ بنا کر رکھ دیتی ہے۔ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس پر دنیا کی ساری تاریخ گواہ ہے اور جس کے نتائج آج خود ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ یہ قوم جس کی حریت ایمانی سے کبھی پوری انسانیت سرگرم عمل تھی آج ایک

راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی ہے، وہ جس کے سوزِ نقیب نے عقل اور علم کو چار چاند لگانے، تہذیب کے گیسو سفوار سے، تمدن کو ترقی کے آخری زینے تک پہنچایا، وہ خود آج بے روح انسانوں کی بھڑ نظر آتی ہے۔ یہ سب اس نئے نظامِ تعلیم کی کرشمہ سازی ہے۔

اسے ہماری بد قسمتی کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ بعض لوگ اپنی سادگی سے ابھی تک یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ تعلیم کا ہر نظام مفید اور کارآمد ہی ہوتا ہے اور انگریزوں نے جو نظامِ تعلیم ہمارے اس ملک میں نافذ کیا ہے وہ چونکہ انگلستان میں مفید اور بہتر نتائج پیدا کر چکا ہے اس لیے یہ لامحالہ ہمارے لیے بھی تریاق کی حیثیت ہی رکھتا ہے اور ہماری ساری برائیوں کا واحد علاج ہے۔ اس لیے وہ بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر جو نیا نظامِ تعلیم مرتب کرنے کے لیے بیٹھتے ہیں اُس میں بعض مضامین کی کمی و بیشی تو کر دیتے ہیں مگر اس نظام کے بنیادی نقشہ میں قطعاً کسی تبدیلی کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اس کا اندازہ قریب قریب وہی رہتا ہے جو اول روز سے انگریزی نظامِ تعلیم کا ہے۔

اگر ان حضرات کی تجاویز اور مشوروں پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ دراصل یہ لوگ ابھی تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ علم تو محض حقائق کی پرودہ کشائی ہے اس لیے دنیا کی ہر قوم کو جو اپنے اندر زندہ رہنے کا داعیہ رکھتی ہے ان حقائق کے قبول کرنے میں کوئی چیز مانع نہ ہونی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے چھوٹے بڑے مصلحین ہمیں برابر یہ مشورہ دیتے جا رہے ہیں کہ ہم آگے بڑھ کر مغربی علوم و فنون کو حاصل کریں اور اس طرح ان فوائد سے متمتع ہوں جو یورپ کو تقسیمِ بیابانوں سے حاصل ہو رہے ہیں۔ اگر خدا کا کوئی بندہ اس قوم کو یہ کہتا ہوتا سناٹی دیتا ہے کہ تم ان علوم کو بے شک حاصل کرو مگر یہ دیکھ لو کہ اس میں بہت کچھ زہر کی آمیزش بھی ہے۔ تو مصلحین کا گروہ فدا اس کے درپے آزاد ہو جاتا ہے اور اسے کٹھ ملا، ترقی کا دشمن، رحمت پسند کہہ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

یہ لوگ علم و فضل کے بلند بانگ دعووں کے باوجود ابھی تک اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ علم سے مراد صرف فطرت کے راز ہاتھ سرستہ کی تلاش و جستجو نہیں بلکہ اس میں بہت سے دوسرے عناصر اور عوامل بھی شامل ہیں اور دنیا میں آج تک کوئی محقق ایسا نہیں گذرا جس نے محض حقائق جمع کرنے میں اپنی قوتیں صرف کی ہوں۔ انسان جب بھی حقیقت کی تلاش میں نکلتا ہے تو کبھی خالی الذہن ہرگز نہیں نکلتا بلکہ اپنے ساتھ فکر و نظر کا زاد راہ لیکر آگے بڑھتا ہے۔ پھر وہ اس نظام تکوینی کے اندر اور اس کے پرے سے جب حقائق کا کھوج لگانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ یونہی دیوانوں کی طرح ہر وادی میں بھٹکتا نہیں پھرتا بلکہ ایک منزل کو دیکھتے ہوئے اُس کی طرف نہایت سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتا ہے۔ اُن راستوں کا تعین کرتا ہے جو اُسے جلد از جلد اُس منزل تک لے جائیں اور اُن پگڈنڈیوں کو چھوڑ دیتا ہے جو اُسے دوسری سمت میں لے جانے والی ہوں۔ حقائق کبھی بھی مقصود بالذات نہیں ہوتے بلکہ ان سے ہمیشہ انسانوں نے نشانِ راہ کا کام لیا ہے۔ اگر سائنس دان اور فلاسفہ اپنی جدوجہد کا محور صرف حقائق کا جمع کرنا ٹھہراتے تو یہ سارے علوم و فنون منتشر واقعات و حوادث کا طومار ہوتے۔ ان میں وہ نظم و ترتیب ناپید ہوتی جو ان میں اب نظر آتی ہے۔ علم محض حقائق کا جمع کرنا نہیں بلکہ انہیں ایک سلسلے میں اس طرح منسلک کرنا ہے کہ ان میں ایک معنوی ربط پیدا ہو۔ اور اُن سے ہم ایک خاص نتیجہ تک پہنچ سکیں۔ ذہنی اور فکری آوارگی اور تحقیق و جستجو میں یہی بنیادی فرق ہے۔ حقائق کو جو چیز باہم مربوط کرنے کے ایک علم کی حیثیت دیتی ہے وہ ترتیب تدوین ہی ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ مختلف نظریات رکھنے والے انسانوں نے قریب قریب ایک قسم کے واقعات سے کس طرح مختلف نتائج مرتب کیے ہیں۔

تاریخ انسانی میں واقعات کی جو مختلف داستانیں بکھری پڑی ہیں انہیں دیکھ کر ایک انسان یہ سمجھتا ہے کہ قوموں کے عروج و زوال میں انسانی بنیادی اخلاق ایک فیصلہ کن قوت ہے۔ جب تو میں اپنے آپ کو ایک خاص قسم کے اخلاق سے متصف کر لیتی ہیں تو انہیں ترقی حاصل

ہوتی ہے اور جب ان میں بد اخلاقی آجاتی ہے، جب ان میں عیش و عشرت کا دور دورہ ہوتا ہے تو وہ منزل کی آغوش میں چلی جاتی ہیں۔ اس نقطہ نظر سے یہ مفکر قوموں کے عروج و زوال کو اخلاقی ترقی اور انحطاط کی تاریخ قرار دیتا ہے۔

ایک دوسرا صاحب فکر انہیں واقعات کو اس طریق پر ترتیب دیتا ہے کہ تاریخ کا ارتقاء نتائج پیداوار کی گردش نظر آتا ہے۔ وہ تاریخی حقائق سے یہ ثابت کرتا ہے کہ دنیا میں کوئی قدر معروضی اور ازلی وابدی نہیں بلکہ یہ سب طریق پیدائش کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ جب دولت پیدا کرنے کے طریقے تبدیل ہوتے ہیں تو پوری انسانی زندگی میں ایک انقلاب آتا ہے۔ ساری اقدار حیات بدل جاتی ہیں اور زندگی کے سارے شعبے ایک دوسرے سانچے میں ڈھلنے لگتے ہیں۔ ایک معاشی نظام، جو درحقیقت ایک خاص قسم کے طریق پیدائش کا ہی مظہر ہے، صرف ایک زمانہ تک تو انسانی ضروریات و حاجات کی کفالت کرتا ہے مگر کچھ عرصہ کے بعد اس نظام کے اندر سے اس کی کھلی توتلیں ظاہر ہوتی ہیں جو اس نظام کی تخریب و شکست کے درپے ہو جاتی ہیں۔ پھر ان دونوں کے مابین تنازع شروع ہو جاتا ہے۔ اس تنازع کے نتیجہ کے طور پر ایک نیا معاشی نظام وجود میں آتا ہے۔ لہذا تاریخ کے میدان میں جو لڑائیاں لڑی جاتی ہیں وہ اس دنیا میں ایک معاشی نظام اور اس کے مخالف نظام کے درمیان وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ اخلاق و مذہب، علوم و فنون اور تمدن و معاشرت سب کے سب ابن الوقتوں کی طرح اپنے زمانے کے غالب معاشی نظام کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔

اسی طرح ایک تیسرے صاحب اٹھتے ہیں اور اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ زندگی کے مادی کارخانے میں تخریب و تعمیر کا جو منہگامہ برپا ہے۔ بگاڑ اور بناؤ کا جو فلم دکھایا جا رہا ہے، زوال و کمال کا جو کھیل کھیلا جا رہا ہے ان سب کے پیچھے روح مطلق اپنا کام کرتی ہے۔ عالم خارجی بذات خود کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کی اہمیت صرف اتنی ہے کہ وہ روح مطلق کے سفیر ارتقا کے لیے نشانِ منزل کا کام دیتا ہے۔

ایک اور صاحب آتے ہیں اور تاریخی شواہد سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ تاریخی ارتقاء تھی (چیلنج) اور اس کے جواب میں انسان کے رد عمل کا نتیجہ ہے۔

اس مقام پر پہنچ کر انسان کے دل میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تاریخ جب محض ماضی کے واقعات و حادثات کا مجموعہ ہے تو پھر فلسفہ تاریخ کے ان نظریات میں اتنا اختلاف کیوں نظر آتا ہے؟ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ اگرچہ دنیا کے ہر مفکر نے اپنے دلپسند نظریہ کی تشکیل میں انہی واقعات و حوادث پر انحصار کیا ہے جو تاریخ انسانی کا مشترک سرمایہ ہیں مگر ہر ایک نے اس تاریخی مواد کو اپنی نظر سے دیکھا ہے، اپنے ذہن سے ترتیب دیا ہے، اور اس سے وہ نتائج اخذ کیے ہیں جو اس کے اپنے طرز فکر سے مناسبت رکھتے تھے۔ اختلاف ان میں جو کچھ ہے وہ حقائق کا نہیں بلکہ ترتیب و تعبیر اور استنتاج کا ہے۔

یہ معاملہ صرف معاشرتی علوم تک ہی محدود نہیں بلکہ ترتیب و تدوین کے ہمہ گیر اور دوسری نتائج ان علوم میں بھی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں جن کا تعلق قوانین فطرت سے ہے اور جن میں اختلاف کی بظاہر بہت کم گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ آپ علم طبیعیات کو ہی لیجیے اور دیکھیے کہ دو مختلف ذہن رکھنے والے افراد انہیں قوانین سے دو بالکل متضاد نتائج اخذ کرتے ہیں۔ ایک آدمی قدرت کے مختلف مظاہر میں جب ہم آہنگی دیکھتا ہے تو اس سے فوراً اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اس کائنات کے پیچھے ایک مدبر کی تدبیر کام کر رہی ہے اور یہ کائنات ایک نقشے اور پلان کے مطابق تخلیق ہوئی ہے۔ اس میں جو کچھ موجود ہے وہ سب کسی علت کا نتیجہ ہے اور سب سے بڑی علت خود اللہ رب العالمین ہے۔ یہ سارا کارخانہ قدرت اپنے اندر ایک گہرا مقصد رکھتا ہے اور اس لحاظ سے انسان اندھی اور بے مقصد قوتوں کے ہاتھ میں ایک بے بس کھلونا نہیں بلکہ ایک صاحب مشیت و ارادہ ہستی ہے جو ان قوتوں سے جس طرح چاہے کام لے سکتی ہے۔

ایک دوسرا منکر انہی مظاہر قدرت سے یہ نتیجہ برآمد کرتا ہے کہ ہماری اس کائنات میں جو ربط و کھائی دیتا ہے وہ فطرت کے قانون یکسانیت (LAW OF UNIFORMITY) کی کوشش سازی ہے۔ مادہ ہی کے اندرونی قوانین نے اس کائنات کے مختلف اجزاء کے درمیان ایک ہم آہنگی پیدا کی ہے۔ اس عالم کے وجود کے لیے کسی ٹینڈنسی یا ذات باری کی کارفرمائی کا یقین ضروری نہیں کیونکہ یہاں علت اولیٰ خود مادہ ہی ہے۔ اس کے سوا انسان کو کچھ معلوم نہیں، نہ معلوم ہو سکتا ہے کہ عالم ربیب و پد کسی خدائی منصوبہ یا کسی بالاتر ذہن و شعور کی مصلحتوں کا نتیجہ نہیں لہذا نہ کوئی قوت حیات ہی ایسی موجود ہے جو اس مادہ پرستی ہم کا اثر ڈال سکے۔ پھر انسان خود اس کائنات میں ایک عارضی اور اتفاقی شے ہے جسے فطرت کی اندھی ہری قوتوں نے خلق کیا ہے۔ وہ بے شک اپنے آپ کو کائنات کا مرکز تصور کرتا ہے مگر یہ محض اُس کی ابلہ فریبی ہے۔

غور کیجئے، کائنات کے موجود حقائق وہی ہیں، اس کے اندر کام کرنے والے قوانین بھی یکساں ہیں، مگر اس کے باوجود انہی کے مشابہ سے یہ دو متضاد نتائج آخر کس طرح اخذ کیے جا رہے ہیں۔ وہ جو ظاہر ہے کہ ان کی ترتیب چونکہ دو مختلف فکری بنیادوں پر کی گئی ہے اس لیے ان کے نتائج بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

ہماری ان گزارشات سے یہ حقیقت منکشف ہو گئی ہوگی کہ علوم و فنون کے اندر اصل اہمیت حقائق کی نہیں بلکہ اُس بنیادی نقطہ نظر کی ہے جس کے مطابق انہیں مرتب کیا جاتا ہے۔ یہ قسمتی ہے ہم کو انگریزی نظام تعلیم نے مغربی علوم سے صرف حقائق ہی نہیں دینے بلکہ وہ بنیادی نقطہ نظر بھی دے دیا جس کے تحت وہ مرتب کیے گئے تھے۔ اب دیکھ لیجئے کہ پچھلے ڈیڑھ سو برس میں ہم نے ان مغربی علوم و فنون کے حاصل کرنے میں جو قوتیں اور صلاحیتیں صرف کی ہیں ان سے ہم کو بحیثیت مجموعی کیا فائدہ پہنچا ہے۔ پوری قوم ان علوم کو پڑھنے کے بعد ایک شدید قسم کے ذہنی انتشار میں مبتلا ہو گئی۔ ہمارے نوجوان ایک طرف تو ان تصورات کو بالکل تڑک کر دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے جو

انہیں ماضی سے ایک مقدس ورثہ کے طور پر ملے ہیں اور دوسری طرف ہمارے مدارس اور کالجوں سے وہ ایسے افکار سے متاثر ہوتے رہتے ہیں جو ان تصورات کی بالکل ضد ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ علوم فنون بجائے انہیں کسی قسم کا فائدہ پہنچانے کے انہیں ایک سخت قسم کی ذہنی کشمکش میں گرفتار کر دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہی چیز موجودہ نظام تعلیم میں سب سے زیادہ ضرورہاں ہے۔ ہم اپنے ہاں جو ایک ذہنی خلفشار اور افلاس دیکھتے ہیں وہ اسی مغربی نظام تعلیم کا نتیجہ ہے۔ اس نے ہماری قوم کو فکری طور پر بالکل تنگی بنا کر رکھ دیا ہے۔ چونکہ میرا تعلق برسوں سے اس نظام تعلیم کے ساتھ چلا آ رہا ہے اس لیے میں اس کے ہلکے اثرات سے بھی پوری طرح واقف ہوں۔ میں نے طلباء کے مختلف طبقات میں گھوم پھر کر اس کے نتائج سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ آج تک جتنے طلباء سے میرا سابقہ پڑا ہے انہیں مندرجہ ذیل تین طبقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے :

ایک بہت بڑی تعداد ان طلباء کی دیکھنے میں آئی ہے جو اس زندگی اور اس کے مسائل کے متعلق کسی سنجیدہ غور و فکر کے قطعاً عادی ہی نہیں رہے۔ ان کی حیثیت بالکل جانوروں کی سی ہے جن کے سامنے بجز چارے کے کوئی دوسرا مقصد نہیں ہوتا۔ چونکہ یہ لوگ سوچ بچار کی زحمت ہی گزارا نہیں کرتے اس لیے ان کے ذہن ہر قسم کی کشمکش سے محفوظ رہتے ہیں۔ مغربی نظام تعلیم نے اس طبقے کو پوری طرح بیکار بنا دیا ہے اور ان سے سوائے اپنے پیٹ کے کسی دوسری خدمت کی توقع رکھنا بالکل عبث اور بیکار ہے۔

دوسرا طبقہ ایسا ہے جو مغربی علوم و فنون پڑھتا تو ہے لیکن ان کے بارے میں سوچتا بہت کم ہے مگر جو بھی ان علوم کے اثرات اس کے ذہن پر مرتب ہونے شروع ہوتے ہیں تو وہ خواہ اس کا زبان سے اقرار کرے یا نہ کرے۔ اس کا یقین بہر حال منترزل ہوتا جاتا ہے اور وہ زندگی کے معاملات سے بالکل شرفیاءہ طور پر بے تعلق ہو جانے ہی میں اپنی عاقبت سمجھتا ہے۔

تیسرا طبقہ وہ ہے جسے اسلام کے بنیادی نظریات و تصورات سے گہری عقیدت و وابستگی ہوتی ہے۔ وہ مغربی افکار کو باطل سمجھتا تو ہے مگر اس کے معاملہ میں مصیبت یہ پیش آتی

کہ تو وہ انہیں باطل ثابت کر سکتا ہے اور نہ اسلام کے متعلق کوئی مثبت علم رکھتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ مغربی علوم سے بہت حد تک مرعوب ہو جاتا ہے اور اسلام کے اساسی تصورات کو ان کے مطابق ڈھال کر اُس تضاد کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اُس کے اپنے دلپند نظریات اور مغربی افکار کے درمیان پایا جاتا ہے۔ مگر جب کسی نقطہ پر ان دونوں کے درمیان تطبیق کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو وہ اسلامی تصورات کو "ملا" کی اختراع کہہ کر بڑی پے باکی سے رو کر دیتا ہے۔

میں نے دین کے لیے قابل رشک محبت رکھنے والے طلباء میں بھی اس ذہنی انتشار کی جھلکیاں دیکھی ہیں اور محسوس کیا ہے کہ یہ لوگ اسلام سے محبت رکھنے کے باوجود اُس سوزِ یقین سے خالی ہیں جو ایک مسلمان کا طرہ امتیاز ہے اور جس کے بغیر عمل کی تڑپ پیدا نہیں ہو سکتی۔ ان بیچاروں کی ساری قوتیں اسی ذہنی کشمکش کی نذر ہو جاتی ہیں، اور وہ دینِ حق کے لیے بڑی مقدس آندھنیوں اور تمنائیں رکھنے کے باوجود اس کی کوئی خدمت نہیں کر پاتے۔

عمر کے اس دور میں جب ذہن ناچختہ ہو، جب فکری صلاحیتیں پوری طرح پروان نہ چڑھ چکی ہوں، جب انسان کا دماغ باہر کے اثرات قبول کرنے کے لیے بالکل تیار رہتا ہو، اس وقت اگر زندگی کے واقعات و حوادث یا مظاہر کائنات کے متعلق کوئی نقطہ نظر ایک شخص کے دل و دماغ میں ٹھا دیا جائے تو پھر اُسے تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے اثرات عمر بھر قائم رہتے ہیں۔ پھر اُس شخص کی ساری زندگی اپنے اسی نظریے کی توجیہ و تعبیر میں گزرتی ہے۔ وہ ہر آن اسی کوشش میں مصروف رہتا ہے کہ اسلامی تعلیمات کی کوئی ایسی تعبیر ہو سکے جس سے اُس کا بنیادی تصور میل کھاتا ہو۔

مثال کے طور پر آپ دیکھیے کہ مغربی نظامِ تعلیم میں ہم جو مضامین پڑھ کر پڑھاتے ہیں ان سے بحیثیت مجموعی ان کے دماغ پر یہ اثر مرتب ہوتا ہے کہ یہ کائنات اور اس کی ہر شے تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ اس کے اندر کوئی چیز بھی ایسی نہیں جسے سکون اور قرار نصیب ہو۔ اس نظریے میں ایک جزو بلاشبہ صداقت کا بھی ہے لیکن اس سے ہمارے نوجوان کو جس نتیجہ تک پہنچایا جاتا ہے وہ یہ ہے

کہ زندگی کے خارجی مظاہر بدل جانے سے اخلاقی اقدار بھی تبدیل ہو جاتی ہیں اس لیے اس زندگی میں کسی ابدی قدر یا کسی حتمی اصول کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا اب وہ نوجوان جو ذرا جبری اور میابک ہوتے ہیں وہ صاف طور پر کہہ دیتے ہیں کہ اسلام ایک وقتی تحریک تھی جس نے اپنے زمانے میں انسانیت کی بہت بڑی خدمت کی لیکن اب ان بدلے ہوئے حالات میں اس کی قطعاً کوئی افادیت باقی نہیں رہی۔ اس کے مقابلے میں وہ لوگ جو اسلام کو چھوڑنا نہیں چاہتے وہ فوراً قرآن مجید میں سے اس نظریہ کی تائید میں کوئی عبارت تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور عام طور پر سورہ الرحمن کی یہ آیت کُلُّ یَوْمٍ هُمْ فِي شَأْنٍ ہي استعمال ہوتی ہے۔ پھر نئے انکار و نظریات کے قبول کرنے میں اگر کوئی چیز مانع نظر آتی ہے تو اسے دور کرنے کے لیے یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اسلام میں اجتہاد کا دروازہ تو قیامت تک کھلا ہوا ہے اس لیے ہمیں اپنے حالات کے مطابق ان مسائل کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ انہی میں سے ایک گروہ ایک قائم اور بڑھا کر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ مرکزیت کو اس امر کا اختیار حاصل ہے کہ وہ وقت کے تقاضوں کے پیش نظر دین میں جو تبدیلیاں چاہے کر لے اور یہی اسلام ہے۔

باقی رہی وہ نہایت قلیل سی تعداد جس کی طبیعت اس قسم کی توجیہات پر مائل نہیں ہوتی اس کا حال بھی اس طبقہ سے کچھ زیادہ مختلف نظر نہیں آتا۔ وہ اپنے ایمان کی عافیت اسی میں سمجھتی ہے کہ دنیا اور اس کے مسائل سے بالکل آنکھیں بند کر لے اور زندگی کے دن اس طریق سے گزارے گویا کہ یہاں کوئی ایسا مشدہ ہی نہیں جو اس کی توجیہ کا محتاج ہو۔ اس طبقہ کی آخری نیا گاہ تصوف ہے اور متصوفانہ خیالات کے اٹھا ہوا سمندر میں ہی ایک مدت گم رہ کر اس طبقہ کے لوگ اپنے خالق اور مالک سے جا ملتے ہیں۔ اس کا رگہ حیات میں یہ حضرات کبھی شریک نہیں سمجھتے اور یہاں بالکل غیر متعلق تماشائیوں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ اپنی ذات میں خواہ کتنے نیک اور پاکیزہ ہوں مگر انسانیت ان سے قطعاً کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ جبر و استبداد یہاں کھلے بندوں پھرتا ہے مگر انہیں اس کے روکنے کی کبھی فکر لاحق نہیں ہوتی۔

یہ ہیں وہ عملی نتائج جو مغرب کے صرف ایک نظر پر کو قبول کر لینے سے ایک مسلمان نوجوان کے ذہن پر مرتب ہوتے ہیں۔ اور جب پوری قوم کو اسی قسم کے باطل نظریات پر پالا جائے تو اس قوم کی حالت زار کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس مغربی نظامِ تعلیم نے ہمارے ذہنوں کے اندر جو انتشار اور خفتسار پیدا کر رکھا ہے اُس نے ہمیں کسی کام کا نہیں چھوڑا اور یہی دراصل وہ عظیم نقصان ہے جو ہمیں اس نظامِ تعلیم سے پہنچا ہے۔

اب اگر ہم اصلاحِ حال کرنا چاہتے ہیں تو اس کی صورت یہ نہیں کہ ہم چند مضامین میں تغیر و تبدل کر دیں یا مغربی علوم و فنون کے ساتھ اسلامیات کے اجزا بڑھا دیں۔ بلکہ اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ مغرب نے جن حقائق کو اپنے باطل نظریات کے مطابق مرتب کیا ہے انہیں ہم اس کے نظامِ فکر سے الگ کر کے اسلامی نقطہ نظر کے مطابق پھر سے مرتب کریں۔ یہ کام مشکل تو ہے مگر محال نہیں۔ آخر ہمارے اسلاف نے بھی تو کائنات کے انہی مظاہر اور حوادث کو ترتیب دیکر اپنے علوم و فنون اس طرح مدون کیے تھے کہ وہ اسلام کی بنیادی حقیقتوں سے ہم آہنگ ہو گئے تھے۔ انہی حقائق کے مطالعہ سے اُن کے اندر وہ عزم اور یقین پیدا ہوا تھا جسے دیکھ کر پہاڑ بھی ندامت سے جھک جاتے۔ جب تک ہم یہ کام نہیں کرتے مسلمانوں کے اندر ایمان کی حرارت اور عمل کی تڑپ کبھی پیدا نہیں ہو سکتی۔

ہماری ان گزارشات کو دیکھ کر ممکن ہے کوئی صاحبِ فکر یہ کہیں کہ جب اس مغربی نظامِ تعلیم سے ہندوستان کی دوسری اقوام خصوصاً ہندوؤں نے بے پناہ فائدہ اٹھایا ہے تو مسلمانوں کو اس سے کیونکر نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس اعتراض میں جو منطقی معالطہ موجود ہے اُسے ہر وہ شخص باسانی محسوس کرتا ہے جو ہندومت اور اسلام کے مزاج سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہو۔ اسلام ایک ہمہ گیر نظامِ حیات ہے جو زندگی کے سارے گوشوں پر پوری طرح حاوی ہے۔

اس وجہ سے جب کسی مسلمان پر فکر و عمل کا کوئی باطل نظام مستط کیا جاتا ہے تو وہ قدم قدم پر اپنے آپ کو ایک شدید کشمکش سے دوچار پاتا ہے۔ ہمارا افواج اس گئی گزری حالت میں بھی اتنا نوزو جانتا ہے کہ اسلام نے زندگی کو اخلاقی اقدار پر استوار کیا ہے مگر جب وہ کالج میں داخل ہو کر علم معیشت پر اپنے استاد کی پہلی تقریر سنتا ہے تو اُس وقت اُس کے کان میں یہ بات پڑتی ہے کہ معاشیات کا اخلاق سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ دولت کمانا اور صرف کرنا زندگی کا ایک الگ شعبہ ہے اور روحانی اور اخلاقی اقدار ایک دوسرے شعبہ زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسی بنیادی تصور پر اُسے معاشیات کی ساری تعلیم دی جاتی ہے اور جلد وہ وقت آجاتا ہے کہ اسلام سے محبت کے باوجود وہ اسے ایک ناقابل عمل چیز یا قصہ پارینہ سمجھنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔

اسی طرح سیاست میں جو نقطہ نظر اُسے اسلام دیتا ہے وہ اس نقطہ نظر سے قطعاً مختلف ہے جس سے اسے ان مغربی طرز کے مدارس اور کالجوں میں روشناس کیا جاتا ہے۔ اسلام نے مملکت کے معاملے میں جو تعلیم اُسے دی ہے وہ یہ ہے کہ مملکت ایک انسانی ادارہ ہے جو محض انسانوں کی خدمت کے لیے وجود میں آتا ہے۔ وہ مقصود بالذات نہیں۔ یہ اعتباری اور مجازی طور پر مقتدر ہے اس لیے اس میں الوہیت کی شان پیدا نہیں ہو سکتی۔ امر و اقتدار سوائے خدا کے کسی کو حاصل نہیں جو ازلی وابدی اور واجب بالذات ہے۔ مگر وہ سگاہوں میں مملکت کے مسئلے پر اُسے یہ تعلیم ملتی ہے کہ مملکت ہر قسم کی اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہے۔ وہ اپنی ذات میں خود ایک خدا ہے اس لیے افراد کا فرض ہے کہ وہ اس کی خاطر اپنے آپ کو بالکل مٹا ڈالیں، وہ اگر جینیں تو اسی کی چاکری کے لیے اور مریں تو اسی کے آستانہ پر۔

یہی حال فلسفہ، اخلاق، معاشرت، شہریت، تاریخ اور دوسرے علوم کا ہے۔ اسلامی تصورات اور مغربی تصورات میں اتنا بعد ہے کہ اُن دونوں کو کبھی یکجا نہیں کیا جاسکتا

اس حقیقت کا خود اُس قوم کے اصحاب فکر تک نے اعتراف کیا ہے جو ہم پر انگریزی

نظام تعلیم مستط کرنے کی شدید آرزو مند تھی۔ مسٹر بی بی جو حکومت ہند کے امور داخلہ کے مسکرٹری تھے انہوں نے واٹنگاف الفاظ میں یہ کہا:

”اس میں قطعاً کوئی تعجب کی بات نہیں کہ مسلمان اس طریقہ تعلیم سے احتراز کرتے ہیں جو اگرچہ فی نضہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو مگر ان کے ملی رجحانات کو قطعاً خاطر میں نہیں لاتا۔ درحقیقت اس سے ان کے فرودی سے فرودی تقاضے بھی پورے نہیں ہوتے یہ طرز تعلیم لازماً ان کے مفاد کے خلاف اور ان کی ملی روایات کے منافی ہے۔“

اسی طرح مشہور انگریز ڈبلیو، ڈبلیو، ہنڈر بھی اسی موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

”حقیقت یہ ہے کہ ہمارا طریقہ تعلیم جس نے ہندوؤں کو ان کی صدیوں کی نیند سے بیدار کیا اور ان کے کاہل عوام میں قومیت کے شریفانہ احساسات پیدا کر دیئے ہیں مسلمانوں کی روایات کے بالکل خلاف اور ان کی ضروریات کے بالکل غیر مطابق ہے بلکہ ان کے مذہب کی تحقیر کرتا ہے۔“

ایک دوسرے مقام پر انگریزی نظام تعلیم کے بارے میں مسلمانوں کے معاندانہ طرز عمل کی ہنڈر بھی بیان کرتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اُس نے اس مسئلہ کا جس صحیح انداز سے تجزیہ کیا ہے وہ بڑا ہی قابل قدر ہے اور اپنے اندر غور و فکر کے بے شمار پہلو رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

”اکثر انگریزوں کی یہ عادت بن چکی ہے کہ وہ مسلمانوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ اس بات پر غضبناک ہوتے ہیں کہ مسلمان اس تعلیم کو ٹھکراتے ہیں جسے ہم ایک ایک شخص تک پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ پھر جس آسانی کے ساتھ ملک کی دیگر اقوام نے اس تعلیم کو اپنانے پر رضامندی کا اظہار کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں کا انکار انگریزوں کو اور بھی برا فروختہ کر دیتا ہے۔ چونکہ ہندو اس نظام تعلیم کے متعلق اپنے دل میں کوئی غلش محسوس نہیں کرتا لہذا ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر مسلمان کیوں خواہ مخواہ اپنے لیے تکلیف کا سامان پیدا کر رہے ہیں۔ دراصل ہم نے اس امتیاز کو بالکل

نظر انداز کر دیا ہے جو بذاتِ خود اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ انسان کا مذہبی رجحان —
 وہ امتیاز جس نے ہر زمانہ اود ہر قوم میں خدا سے واحد کی پرستش کرنے والوں کو مشرکین سے
 جدا رکھا۔ مشرک اپنی پرستش کے لیے بہت سے معبود رکھتے ہیں اور اس بنا پر ان کے
 اعتقادات کے بھی کوئی ایک جیسے ہو جاتے ہیں۔ لیکن نئے یونانیوں کے متعلق جو آخری فیصلہ
 کیا تھا وہ اس وقت ہندوؤں پر کہیں زیادہ ٹھیک عائد ہوتا ہے۔ ناقابلِ تقسیم اود
 باضابطہ اعتقاد کی بجائے جو معتقدین کے اعتقاد و پسندوں و دماغ پر کلیتہً حاوی ہو جائے
 یونانی علم الاصلام کی بناوٹ ہر اہلِ باقسم کے آزاد اود لچکدار حصوں کا ایک مجموعہ ہے۔ لہذا
 ان معبودوں کی پرستش کرنے والوں کو بھی اپنے مذہبی اعتقاد کی گہرائی اود درجے مقرر کرنے
 کی پوری پوری آزادی حاصل ہے۔ لیکن مسلمانوں کے لیے اس قسم کی آزادی ناممکن ہے
 مذہبِ اُن سے غیر مشروط، سرگرم اود بے لچک اعتقاد کا خواہاں ہے۔ لہذا جو طریقہ
 تعلیم اُن کے مذہبی اصولوں کو نظر انداز کرے کسی سچے مسلمان کو مطمئن نہیں کر سکتا۔

ہنٹر صاحب نے مسلم اود غیر مسلم کے بنیادی نقطہ نظر میں جو فرق ہے اُس کی بالکل صحیح نشاندہی
 کی ہے۔ ایک مسلمان چونکہ زندگی کا ایک خاص نقطہ نظر اود ایک متعین اسلوبِ حیات رکھتا ہے
 اس لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ مسلمان رہتے ہوئے اپنی انفرادی یا اجتماعی زندگی کے کسی گوشہ میں
 کوئی ایسی چیز اصولاً گوارا کر لے جو اُس کے اساسی تخیل سے متصادم ہو۔ اس کے برعکس ہندو کے
 نزدیک مذہب چونکہ خالق و مخلوق کے مابین ایک پراسٹیوٹ رشتہ ہے اس لیے حیاتِ انسانی کے
 ایک مختصر سے گوشہ کو چھوڑ کر وہ زندگی کے باقی شعبوں میں ہر قسم کے اصول و نظریات قبول کرنے
 پر بڑی آسانی سے آمادہ ہو سکتا ہے۔ یہی وہ اصل سبب ہے جس کی بنا پر مسلم قوم کے بھی خواہوں نے
 انگریزی نظامِ تعلیم کی مخالفت کی تھی۔ وہ ترقی کے دشمن نہ تھے۔ انہیں مغربی علوم و فنون سے بھی کوئی پریشانی
 نہ تھی، انہیں انگریزی زبان سے بھی بحیثیت ایک زبان کے کوئی نفرت نہ تھی۔ وہ اگر مخالف تھے تو اس بات

کے تھے کہ اس نظام تعلیم کو جوں کا توں اپنا لیا جائے اور اس قوم کے نوجوانوں کے سامنے تعلیم کا مقصد سوائے روٹی کمانے کے اور کوئی نہ رہے۔ تاریخ کے اوراق شاید میں کہ ان حضرات کے خدشات بالکل صحیح ثابت ہوئے اور سرسید کا یہ خواب کہ "فلسفہ ہمارے دلائل ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر، خواب ہی رہا، تشریح مندرجہ تعبیر نہ ہو سکا۔ علی گڑھ نے نہ تو مذہبی نقطہ نظر سے کبھی قابل رشک شہرت حاصل کی اور نہ وہ عام علمی احیاء ہی کا مرکز بن سکا۔ اس ادارے کے مقاصد خواہ کتنے ہی نیک اور بلند ہوں مگر اس کی عملی افادیت صرف اسی قدر تھی کہ وہ مسلمان نوجوانوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں سرکاری ملازمتوں کے لیے تیار کر دے۔ اس کا نتیجہ جو ہونا تھا وہی ہوتا۔ اساتذہ اور طلبہ میں مادیت اور ظاہر پرستی پیدا ہو گئی۔ سرسید کا خیال تھا کہ علی گڑھ والے اسلامی ہندوستان کی شاندار روایات کے وارث ہونگے اور اسلام پر غیر مسلموں نے جو اعتراض کیے ہیں ان کا دندان شکن جواب دیں گے۔ لیکن یہاں عالم یہ تھا۔

در بغل تیر و کہاں کشتہ نچیر شہدیم

نظام تعلیم کے متعلق کوئی بحث بھی مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے ساتھ زبان کا ذکر نہ کیا جائے۔ جس طرح بعض مسلمان مغربی علوم و فنون کے متعلق اس غلط فہمی میں گرفتار ہیں کہ یہ محض حقائق کی پردہ کشائی ہے اور ان سے صرف ذہنی افق ہی وسیع ہوتا ہے۔ اسی طرح زبان کے مسئلہ کو بھی یہ لوگ محض ایک ادبی مسئلہ سمجھتے ہیں۔ جس کا کوئی تعلق کم از کم کوئی خاص تعلق کسی قوم کے مذہب اور تہذیب سے نہیں ہے۔ لیکن یہ بہت بڑا دھوکا ہے جس میں کوئی شخص مبتلا ہو سکتا ہے۔ کسی قوم کی زبان اُس کے افراد کے درمیان محض اظہار خیال کا ذریعہ ہی نہیں ہوتی بلکہ یہ وہ زبردست قوت ہے جس سے احساسات و کیفیات کی ساری منتشر طاقتیں شخصیت کی گہرائیوں میں سمٹی جاتی ہیں۔ اس سے ہمارے اندر ایک خاص ذہنی میلان پرورش پاتا ہے جو بالآخر ایک خاص طرز فکر اور ایک خاص قسم کی سیرت و کردار پر منتہی ہوتا ہے۔ اسی کی وساطت سے ایک قوم اپنے ماضی اور اس کی تاریخی وراثت

سے وابستہ رہتی ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر قومیت کو بنانے اور بگاڑنے میں تہذیب کو زندہ رکھنے اور فنا کر دینے میں قومیت کا مذہب سے تعلق باقی رکھنے اور منقطع کر دینے میں زبان کا اثر غیر معمولی ہوتا ہے۔ جس قوم کے پاس اپنی زبان اور اپنا رسم الخط ہے۔ وہ ایک مستقل قوم ہے اور جو قوم اپنی زبان اور رسم الخط کو بدل دینے پر آمادہ ہو جائے اس کے متعلق سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اپنی موت کے وارث پر دستخط کرنے کی حماقت کر رہی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم پنڈت جوہر لال نہرو جیسے وسیع المشرب انسان کی چند تصریحات پیش کرتے ہیں۔

• ایک قوم کی زبان کا مسئلہ ہمیشہ بڑا اہم مسئلہ رہا ہے۔ آج سے تین سو برس پہلے ملٹن نے فلورنس کے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے اس کی اہمیت کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا۔ کسی قوم کے اپنی ایک زبان رکھنے کو، خواہ وہ زبان بگڑی ہو، یا خالص ہو، ایک غیر اہم سا واقعہ نہ سمجھ لینا چاہیے اور نہ اس امر کو کہ اس کے افراد زبان کے برتنے میں صحت کا کہاں تک لحاظ رکھتے ہیں۔ کوئی تاریخی شہادت ایسی نہیں ملتی کہ کوئی سلطنت یا مملکت اس وقت تک اوسط درجے کی خوشحالی و فلاح سے محروم کر دی جا سکتی ہو جس وقت تک اس کے افراد اپنی زبان کو پسند کرتے اور اس کی طرف کافی توجہ کرتے رہے ہوں۔“

ایک دوسری جگہ پنڈت جی فرماتے ہیں :-

• ”رسم الخط ادب کا بہت گہرا تعلق ہے اور رسم الخط کی تبدیلی اس زبان کے لیے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جس کا ماضی شاندار رہا ہو۔ رسم الخط بدلنے کے ساتھ الفاظ کی شکلیں بدل جاتی ہیں۔ آوازیں بدل جاتی ہیں اور خیالات بدل جاتے ہیں۔ قدیم اور جدید ادب کے درمیان ایک ناقابلِ عبور دیوار حائل ہو جاتی ہے اور قدیم ادب ایک اجنبی زبان کا ادب بن کر رہ جاتا ہے جو مردہ ہو چکی ہو۔“ میری کہانی جلد اول ص ۲۹۵

چھ حصے ہیں۔ ہر حصہ چھ یا سات ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب میں پہلے عربی زبان کے قواعد بتائے گئے ہیں اور پھر آخر میں عربی سے اردو اور اردو سے عربی میں ترجمہ کرنے کے لیے مفید دی گئی ہیں۔ ان چھ حصوں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر حال یہ ایک کامیاب سلسلہ ہے جس سے عام اردو دان حضرات اپنی دوسری مصروفیات کے ساتھ ساتھ ہر روز پندرہ بیس منٹ کا وقت نکال کر فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اس طرح چھ ماہ میں (اگر ہر روز ایک سبت یا بندی سے پڑھا جائے) اس قابل ہو سکتے ہیں کہ قرآن و حدیث کا براہ راست مطالعہ کر سکیں۔ عربی فقروں میں اگرچہ کہیں کہیں زبان کی غلطیاں نظر آتی ہیں لیکن ہر حال یہ غلطیاں سخت نوعیت کی نہیں ہیں۔ امید ہے اگر مؤلف اگلے ایڈیشن کے وقت قدرے اہتمام اور وقت نظر سے کام لیں تو خود ہی ان غلطیوں کو درست کر لیں گے۔ البتہ چند باتیں ہم ان سے ضرور عرض کر دینا چاہتے ہیں۔ ایک یہ کہ انہوں نے اس سلسلہ میں بیچ کا بہت کم خیال رکھا ہے۔ جس معیار کے فقرے ترجمہ کے لیے پہلے حصہ میں دیئے گئے ہیں، چھٹے حصہ میں بھی تقریباً اسی معیار کے فقرے پائے جاتے ہیں۔ دوسرے عربی جملے چونکہ انہوں نے خود بنائے ہیں اس لیے ان پر کہیں کہیں اردو اسلوبی کی جھلک پائی جاتی ہے بہتر ہوتا کہ وہ محنت کر کے تمام فقرے قرآن حدیث اور ادب کی معتبر کتابوں سے اخذ کرتے، تاکہ پڑھنے والے کے ذہن پر شروع ہی سے عربی اسلوب نقش ہو جاتا، تیسرے یہ کہ انہوں نے قواعد بیان کرتے ہوئے بعض ایسی باتوں کو جن سے ناظر قرآن پڑھنے والا ہر شخص یا تو واقف ہوتا ہے، یا پڑھتے وقت استاد سے ضمنی طور پر معلوم کر ہی لیتا ہے، بہت زیادہ تفصیل، اہتمام اور تذکرار سے بیان کیا ہے جس کی وجہ سے یہ سلسلہ بلاوجہ زیادہ لمبا ہو گیا ہے ہمارا خیال ہے کہ اگر وہ اس قسم کی باتوں کو بڑی حد تک حذف کر دیتے تو یہ سلسلہ زیادہ مفید بھی رہتا اور عام لوگوں کے لیے اسے خریدنا اور پڑھنا زیادہ آسان بھی ہوتا۔ (محمد عامر)

(بقیہ اشارات)

اگرچہ زبان اور رسم الخط کی اہمیت پر بہت سی ایسی شہادتیں بھی نقل کی جا سکتی ہیں جو علیٰ حقیقت سے

نسبتاً زیادہ وسیع نہیں مگر ہم نے قصداً یہ شہادت اس لیے پیش کی ہے کہ پندرہ جی کا شمار ان لوگوں میں ہونا چاہیے جو بڑے روشن خیال ہیں اور کبھی اس قسم کے معاملات پر غور و فکر کو رحمت پسندی سے تعبیر کیا کرتے تھے۔

تعلیمی زبان کی تبدیلی کے جو اثرات ہندوستان میں مسلمان قوم پر مرتب ہوئے وہ کسی شخص سے پوشیدہ نہیں ہمارے غیر ملکی حکمرانوں کے غلاموں کی زبان دھونا کیوں نہیں ہو سکتی جو کہ ہمیں انہیں نہ تو دربار دیکھا اور نہ انہیں جلانے کی کوشش کی! انہوں نے صرف ذریعہ تعلیم بدلا اور نرتی کے دروانے انگریزی جاننے والوں کے لیے وقف کر دیئے۔ سو سال کی مدت کسی قوم کی زندگی میں کوئی بڑی مدت نہیں ہوتی مگر دیکھیے کہ صرف سو سال کے اندر ہم کس انجام تک پہنچے۔ ہمارے نوجوان دنیا مکائے کی غرض سے انگریزی پڑھ کر پڑے اور اپنی زبان، اپنے مائے اپنی قومی زبان سے اپنے لٹریچر سے اپنی تہذیب و تمدن اس طرح بیگانہ ہوئے گویا کہ وہ اس قوم کے افراد ہی نہیں ہیں انگریزی زبان اپنے ساتھ ایک غیر قوم کے خیالات بھی لے آئے ان کے دل و باغ میں نفوذ کرتی چلی گئی اور اسے ان کو اندر سے بدلنا شروع کیا یہاں تک کہ وہ مقصد تقریباً حاصل ہو گیا جس کو پیش نظر رکھ کر میکائے اور اس کے ہم خیال لوگوں نے ذریعہ تعلیم کو تبدیل کیا تھا۔

ترکی میں صرف رسم الخط بدلا گیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ترکی قوم اس پاس کی ان مسلمان قوموں کے گت گت حصے کے ساتھ صدیوں اس کا تعلق چلا آ رہا تھا پھر اس کا رشتہ خود ترکی زبان لینے والے ان لوگوں سے بچھیننے لگا جو ترکی کے باہر پائے جاتے تھے اور جو بھی پڑانے رسم الخط میں کھنٹے اور پڑھنے کے عادی تھے۔ اس تبدیلی سے ملک کے باشندوں کے یسوان کی پھلی نسلوں کا سلا علی وادبی کارنامہ ایک جینی چیز بن کر گیا جو صدیوں کے دوران میں فراہم ہوا تھا۔ یہ گویا اس امر کا اعلان تھا کہ پھلی صدیوں میں ترک قوم کوئی ایسی چیز پیدا کرنے کے قابل نہ تھی جس پر اس کے خلاف فخر کر سکیں اور جسے زندہ رکھنے کے قابل پائیں۔ وہاں صورت حال یہ ہے کہ اس ملک کے کتب خانوں میں ترک علماء و فضلا احوال علم کی ہشمار کتابیں بیکار پڑی ہیں جنہیں پڑھنے اور سمجھنے والا ملک میں کوئی نہیں ہے۔ اس معاملے میں لطف کی بات یہ ہے کہ اب مذہبی تعلیم کے از سر نو آغاز کے بعد ترکوں کو بھی یہ ضرورت پیش آئی ہے کہ اپنے اماموں اور خطیبوں اور فوج کے مذہبی معلموں اور دیگر مذہبی مدرس کے اساتذہ اور طلباء کو اس قابل بنائیں کہ وہ پچھلے زمانے کے ترک علماء کی کتابیں پڑھ سکیں چنانچہ اب ہاں اپنی ہی زبان کے رسم الخط کی تعلیم اس طرح دی جا رہی ہے جسے کسی غیر ملکی زبان کی تعلیم دی جاتی ہے اور دنیا کے نئے نئے نصاب میں لسانی